© rasailojaraid.com

شیخ نذیر حسین

چند روز ہندوستان کے علمی اور تصنیفی اداروں میں

ہندوستان کے بعض علمی و دینی اداروں خصوصاً دار المصنفین اعظم گڑھ اور دار العلوم ندوۃ العلما کو دیکھنے کی ایک مدت سے آرزو تھی۔ الحمد للہ کہ دار المصنفین کے ایک سیمینار نے یہ آرزو پوری کر دی۔ جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے جنوری ۱۹۸۲ء کے اوائل میں مجھے دعوت دی کہ میں دار المصنفین اعظم گڑھ کے زیر انتظام سیمینار میں شرکت کروں جو کہ "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ۲۱، ۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو منعقد ہو رہا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا کے حصول اور دوسرے موانع و مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے بعد راقم السطور ۲۲ فروری کو اعظم گڑھ پہنچ گیا۔ اعظم گڑھ بنارس سے ستر، اسی میل شمال مشرق، یوپی کے آخری کونے پر واقع ہے۔ اعظم گڑھ کے نواحی قصبات ہمیشہ سے علوم دینیہ کے مرکز رہے ہیں اور ان کی خاک سے بہت سے علما اور صلحا اٹھے ہیں۔ میری آمد سے دو روز قبل پاکستان سے جناب حکیم محمد سعید (ہمدرد دواخانہ طبی مشیر صدر پاکستان، ڈاکٹر عبد الواحد ہالے پوتہ، ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد اور ان کے چار رفقا اور مفتی سیاح الدین کاکا خیل (فیصل آباد) اعظم گڑھ پہنچ چکے تھے۔ مہمانوں کے لیے علیحدہ علیحدہ خیموں کا بہت اچھا انتظام تھا۔

شب بسری کے بعد نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی مجھے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ) کی قیام گاہ کی تلاش ہوئی۔ پتا چلا کہ موصوف دار المصنفین کے مہمان خانے میں مقیم ہیں۔ ملاقات پر مولانا موصوف نے حسب معمول محبت و گرم جوشی کا اظہار فرمایا، حاضرین مجلس سے میرا تعارف کرایا اور فرمایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین جیسا اہم بالشان علمی کام نہ تو مصر میں ہو رہا ہے اور نہ شام میں۔ انسائیکلوپیڈیا کی پیش رفت کے بارے میں بھی سوالات کرتے رہے۔ آخر میں مجھے لکھنؤ آنے اور دار العلوم ندوۃ العلما میں ایک دو روز قیام کرنے کی نہایت محبت سے دعوت دی۔ اس کے بعد میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مدیر برہان دہلی) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے میرا تعارف مہمانان کرام مفتی عتیق الرحمان عثمانی (ندوۃ المصنفین)، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور قاضی سجاد حسین (صدر مدرس مدرسہ عربیہ فتح پوری، دہلی و مترجم مثنوی مولانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روم) سے کرایا۔ قاضی زین العابدین آج سے پینتالیس چھیالیس برس قبل مولانا تاجور کے ساتھ رسالہ ادبی دنیا میں بطور مدیر معاون کام کرتے رہے ہیں۔ قاضی زین العابدین کے بیٹے زین الساجدین مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے لیکچرار ہیں اور نہایت سعادت مند اور خدمت گزار نوجوان ہیں۔ مجھے پروفیسر خلیق احمد نظامی (علی گڑھ) مصنف مشائخ چشت سے بھی ملنے کا شوق تھا۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب مجھے ان کے پاس لے گئے۔ خلیق صاحب نہایت محبت و تپاک سے ملے اور فرمایا کہ انھوں نے مشائخ چشت کا تذکرہ سات جلدوں میں لکھا ہے۔ ان میں سے ایک جلد شائع ہو چکی ہے، دوسری زیر طباعت ہے اور باقی بھی وقفے وقفے سے شائع ہوتی رہیں گی۔ جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے اپنا تعارف خود کرایا۔ فاروقی صاحب اردو کے مشہور ادیب و نقاد ہیں، مگر میرے نزدیک وہ نہایت غیرت مند اور دردمند مسلمان بھی ہیں۔ مولانا عمران خان ندوی (بھوپال) سے بھی پرلطف ملاقات رہی۔ مولانا ابواللیث اصلاحی (امیر جماعت اسلامی ہندوستان) سے بھی نیاز حاصل ہوئے۔

سیمینار

سیمینار کا افتتاح ۱۲ فروری کو ہوا۔ افتتاحی تقریروں کے بعد مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کے مسودوں اور قلمی کتابوں کی نمائش ہوئی، جو قابل دید تھی۔ دوسرے دن پاکستانی فضلا نے مقالے پیش کیے۔ افسوس کہ راقم الحروف دیر سے پہنچنے کی وجہ سے ان اجلاس میں شرکت سے محروم رہا۔ تیسرے دن سیمینار نو بجے صبح ہوا۔ اس نشست کے صدر ڈاکٹر سید سلمان ندوی تھے، جو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور کے فرزند ارجمند اور ڈربن یونیورسٹی (افریقہ) میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں۔ مقالات چوں کہ زیادہ تھے، لہٰذا ہر مقالہ نگار کو پانچ پانچ منٹ تقریر کے لیے دیے گئے۔ ان مقالات میں ڈاکٹر اوصاف علی (ہمدرد فاؤنڈیشن دہلی) کا مقالہ معاصر مستشرقین پر تھا اور خاصا معلومات افزا تھا۔ دوسرا اہم مقالہ خواجہ احمد فاروقی کا تھا، جس میں ان ہندی علما کا ذکر خیر تھا جنھوں نے عیسائی مشنریوں کے مقابلے میں اسلام کا دفاع کیا۔ اس کے بعد مشہور مصری فاضل اور مفکر جناب یوسف القرضاوی نے فصیح و بلیغ عربی میں تقریر کی۔ ان کی تقریر میں آبشار کا سا زور تھا۔ تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ صحیح اسلام وہی ہے جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہے اور جس پر صحابہ کرام نے عمل کر کے دکھایا۔ افسوس کہ راقم الحروف کا مقالہ بعنوان "مستشرقین اور علوم اسلامیہ" سیمینار کے اختتام کے بعد دوسرے دن پہنچا۔ اب یہ مقالہ مجموعۂ مقالات میں شامل ہوگا۔ آخر میں مولانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صباح الدین عبدالرحمان صاحب ناظم دارالمصنفین نے سب مہمانوں خصوصاً راقم السطور اور جناب عبدالرحمان صاحب کوندو کا گلوگیر آواز میں شکریہ ادا کیا جو بے شمار موانع اور مشکلات کے باوجود لاہور اور سری نگر سے شریک ہوئے تھے۔

اس سیمینار کے ذکر میں مولوی سید سلمان حسنی ندوی کا بھی ذکر ضروری ہے، جو اردو اور انگریزی تقریروں عربی میں اور عربی تقریروں کا اردو میں خلاصہ بیان کر رہے تھے۔ یہ سیمینار ہر طرح سے کامیاب رہا۔ سیمینار کامیاب بنانے اور مہمانوں کو راحت و احترام پہنچانے کے لیے جناب سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب، کے رفقا اور شبلی نیشنل کالج کے طلبا نے بڑی محنت کی، جس کے تمام لوگ معترف تھے۔ شام کو بیشتر مہمان رخصت ہو گئے اور راقم السطور، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور جناب عبدالرحمان کوندو خیموں سے اٹھ کر دارالمصنفین کے مہمان خانے میں آ گئے جہاں ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر تھا۔ عبدالرحمان کوندو صاحب سری نگر کی ذی علم شخصیت ہیں۔ انھوں نے مولانا انور شاہ مرحوم کے حالات میں حیاتِ انور لکھی ہے جس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

دارالمصنفین

دارالمصنفین یا شبلی اکاڈمی مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے علمی خوابوں کی تعبیر ہے۔ اس کی تعمیر و ترقی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی خدمات اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کی انتظامی صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے۔ سیرت النبیؐ کی تالیف و اشاعت کے سلسلے میں یہ ادارہ ملک گیر شہرت حاصل کر چکا ہے اور سیرت کے علاوہ گزشتہ چھیاسٹھ برسوں میں مختلف علمی و دینی موضوعات پر ایک سو دس کتابیں شائع کر چکا ہے۔ دارالمصنفین شہر اعظم گڑھ سے ایک میل باہر ایک پُر فضا باغ میں واقع ہے جس کا رقبہ پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کے برابر ہے۔ دفتر، کتب خانے، پریس اور مہمان خانے کی عمارتیں پختہ اور شان دار ہیں۔ رفقا کے لیے بھی آرام دہ مکانات ہیں۔ ان سب عمارتوں میں دارالمصنفین کی چھوٹی مگر خوب صورت اور نازک سی مسجد جاذبِ توجہ ہے، جو نواب منزل الرشید خاں (علی گڑھ) کی فیاضی اور مولانا مسعود علی ندوی کے عمارتی ذوق کی مظہر ہے۔ مسجد کے صدر دروازے سے کچھ فاصلے پر مولانا شبلی اور ان کے بیٹے حامد نعمانی کی قبریں ہیں جو کچی ہیں۔ ایک کونے میں مولانا مسعود علی ندوی سابق مینیجر دارالمصنفین محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ اب دارالمصنفین کے ناظم یا روحِ رواں جناب سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب ہیں، جو اردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز، فارسی زبان کے ادیب و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محقق اور تاریخ اسلام کے صاحبِ بصیرت عالم ہیں۔ موصوف سراپا محبت و شفقت اور پیکرِ مروت و شرافت ہیں۔ دوسری علمی شخصیت مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی ہیں، موصوف تواضع و انکسار کا نمونہ ہیں۔ اصلاحی صاحب "تذکرۃ المحدثین" کی دو جلدیں شائع کر چکے ہیں، تیسری جلد طباعت کے مراحل میں ہے۔ دارالمصنفین سے متصل شبلی نیشنل کالج ہے، جہاں ڈھائی ہزار طلبا زیرِ تعلیم ہیں۔ ان کی سادگی اور دین داری قابلِ ذکر ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی

دوسرے دن ناشتہ کے بعد مجھے اور کوندو صاحب کو محدثِ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے سے ملنے کی تمنا ہوئی۔ مولانا اعظمی مولانا انور شاہ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور کم و بیش پچاس برس سے کتبِ حدیث کا درس دے رہے ہیں۔ مصنف عبدالرزاق کی اشاعت نے انھیں بین الاسلامی شہرت عطا کی ہے۔ بعض حدیثی مشکلات کے حل کے لیے راقم السطور ان سے رجوع کرتا رہا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کا وطن مئو ناتھ بھنجن ہے جو اعظم گڑھ سے تیس میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں بس جاتی ہے۔ میں اور کوندو صاحب بس سے سفر کرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پوچھتے پچھاتے مولانا اعظمی کے فضیلت کدے پر حاضر ہوئے۔ سلام مسنون کے بعد کوندو صاحب نے میرا تعارف کرایا تو مولانا اعظمی مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ نہایت مسرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے "میں تو دل کے دورے کی وجہ سے دارالمصنفین کے سیمینار میں شریک نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنا بڑا بیٹا بھیج دیا تھا اور اسے تاکید کر دی تھی کہ اگر شیخ صاحب (راقم السطور) لاہور سے آئے ہوں تو انھیں ضرور لایا جائے۔" میں نے عرض کیا کہ بندہ خود حاضر ہو گیا ہے۔ فرمانے لگے کہ کل رات مشہور مصری عالم جناب یوسف القرضاوی بھی ان سے ملنے آئے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمیں اپنی بیٹھک میں لے آئے جہاں چاروں طرف الماریوں میں کتابیں بھری تھیں۔ انھوں نے اپنی شائع کردہ حدیث کی کتابیں دکھائیں۔ ان میں حدیث کی ایک نایاب کتاب زوائد البزار بیروت سے دو جلدوں میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوئی ہے۔ اب مولانا اعظمی مصنف ابن ابی شیبہ کی تصحیح و تعلیق میں مصروف ہیں اور اس کی تین جلدیں چھپنے کے لیے حجاز بھیج چکے ہیں۔

کوندو صاحب نے مولانا اعظمی سے انوار الباری (ترجمہ و شرح اردو صحیح بخاری از سید احمد رضا بجنوری) کے متعلق رائے دریافت کی۔ مولانا اعظمی نے فرمایا کہ بجنوری صاحب نے بعض مقامات پر متشددانہ کلام کیا ہے۔ حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں، جو اکابر علمائے دیوبند کی علمی روایت کے خلاف ہے۔ مولانا نے سلسلۂ کلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے استاد مولانا انور شاہ مرحوم و مغفور نے کبھی کسی امام یا مجتہد کی تنقیص یا تحقیر نہیں کی، وہ ہمیشہ امام ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام اور حافظ ابن حجر کو حافظ الحدیث کے لقب سے یاد کرتے رہے۔ راقم السطور نے صحیح بخاری کی مختلف شروح (فتح الباری اور عینی) کے متعلق ان کی رائے پوچھی۔ فرمانے لگے جہاں تک حدیث کے فنی مباحث کا تعلق ہے، فتح الباری کو تمام شروح پر فوقیت حاصل ہے، لیکن عینی (عمدۃ القاری) میں بعض معلومات (مثلاً نحوی مشکلات کا حل، بلاغی نکات کا بیان اور فقہی مسائل کی صراحت) فتح الباری سے زائد ہیں، اس لیے ایک مدرس یا صاحب ذوق عالم کے لیے ان دونوں شرحوں کا مطالعہ لازمی اور ضروری ہے۔ مولانا اعظمی فنون حدیث کے علاوہ تاریخ اور ادب کا بھی ستھرا ذوق رکھتے ہیں، طبقات اور تراجم کی کتابوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ میرے رفیق سفر ندوی صاحب کو سید علی ہمدانی اور کشمیر کے دوسرے علما کے حالات کی جستجو تھی۔ وہ ان کے حالات دریافت کرتے رہے اور مولانا اعظمی متعلقہ کتب کی نشان دہی فرماتے رہے۔ کھانے کے بعد ہم نماز پڑھنے کے لیے قریب کی مسجد میں گئے۔ مولانا اعظمی نے یہ مسجد سات آٹھ لاکھ روپے [illegible] سے تعمیر کرائی ہے۔ نماز کے بعد نمازیوں سے ہمارا تعارف کرایا اور مسجد کے تمام حصے بڑے شوق سے [illegible] مسجد سے واپسی پر دیکھا کہ بہت سے ہندو ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا سے تعویذ لینے آئے ہیں۔

مولانا اب درس و تدریس کو چھوڑ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے ہیں، ان کی عمر اسی، بیاسی برس کے قریب ہے، لیکن صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے اور اپنی عمر سے کم معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا گھر کے بھی خوش حال ہیں، یو۔ پی اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں، لیکن رہن سہن بالکل سادا اور درویشانہ ہے۔ علم و فضل کے باوجود غرور و تمکنت اور خودستائی نام کو نہیں۔ علمی انہماک کا یہ عالم ہے کہ [illegible] بروکلمان کی تاریخ ادب العربی (عربی ترجمہ) پر استدراک لکھ رہے ہیں اور بعض شوقین طلبا کو مقدمہ ابن الصلاح بھی پڑھاتے ہیں۔ طلبا کی آمد پر ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور مولانا نے دعائیں دے کر ہمیں رخصت کیا۔ مولانا کے بڑے صاحب زادے مولوی رشید احمد صاحب دور تک ہمیں چھوڑنے آئے۔

شام کے چھ بجے ہم واپس دار المصنفین پہنچ گئے۔ رات کو مولانا صباح الدین عبدالرحمان صاحب ہمارے کمرے میں تشریف لائے اور دیر تک دار المصنفین کے آئندہ اشاعتی پروگرام کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ اب اسلام کی اقتصادیات، اسلام کی معاشیات اور اسلام کے نظام حکومت پر کتابوں کی ترتیب

© rasailojaraid.com

تالیف کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ عالمِ اسلام کی اہم ترین ضرورت فقہِ اسلامی کی تدوینِ جدید ہے۔ مولانا نے میری گزارشات کو بڑے غور سے سنا۔

شہر اعظم گڑھ کی آبادی ستر اسی ہزار نفوس پر مشتمل ہے، جن میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے، دوکانوں اور مکانوں کے نام ہندی میں لکھے ہوئے ہیں۔ شہر صاف ستھرا ہے۔ شبلی کالج کے علاوہ [illegible] اے۔ وی کالج اور ایک زنانہ کالج بھی ہے۔ شہر کے نواحی قصبات سرائے میر، مبارک پور اور مئو ناتھ میں احناف اور اہلِ حدیث کے متعدد مدارس ہیں، جن میں تین، ساڑھے تین ہزار کے قریب عربی خوان طلبا زیرِ تعلیم ہیں۔ افسوس ہے کہ قلتِ وقت کے باعث ہم ان مدارس کو نہ دیکھ سکے۔ شہر اور قصبات سوتی کپڑے کی صنعت کا بڑا مرکز ہیں اور یہ صنعت تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، بنارس کا بھی یہی حال ہے۔ شہروں میں دھوتی استعمال سے خارج ہو رہی ہے۔ اب ہندو نوجوان پتلون نما پاجامے پہنتے ہیں، جب کہ [illegible] مان چھوٹی مہری کا قدیم وضع کا پاجامہ پہنتے ہیں۔

تیسرے دن راقم السطور احباب دار المصنفین سے رخصت ہو کر شاہ گنج کے راستے لکھنؤ [illegible] ہوا، مولانا عمران خاں ندوی صاحب بھی رفیقِ سفر تھے۔ وہ بہ کمال مہربانی سفرِ لکھنؤ کے [illegible] اند بھوپال کی عظمتِ رفتہ کی داستان سناتے رہے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بہت [illegible] مان تلاشِ معاش میں بھوپال سے کراچی چلے گئے ہیں اور ان کے بجائے تقسیم [illegible] جہت سے مسلمان اندور اور گوالیار کی سکونت ترک کر کے بھوپال میں آ [illegible] شہر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی کا تناسب تقریباً برابر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ [illegible] یونیورسٹی بھی قائم ہو چکی ہے جہاں ان کے صاحب زادے ڈاکٹر حسان خاں [illegible] میں استاد ہیں۔ مولانا عمران خاں صاحب نے تاج المساجد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ [illegible] سب سے بڑی مسجد ہے، جو نواب شاہ جہان بیگم مرحومہ کی وفات کی وجہ سے نامکمل رہ گئی تھی۔ اب انھوں نے ساٹھ، ستر لاکھ روپے جمع کر کے مسجد کو مکمل کرایا ہے اور اس میں ایک دار العلوم بھی قائم کیا ہے جو وسطی ہند (مدھیہ پردیش) کا سب سے بڑا دینی تعلیم کا مرکز ہے۔ میں نے محدثِ کبیر شیخ حسین بن محسن یمانی کے خاندان کے حالات دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ شیخ خلیل عرب اپنے اہل و عیال کو لے کر کراچی چلے آئے تھے جب خاندان کے دیگر افراد معمولی ملازمتوں پر گزر بسر کر رہے ہیں اور انھیں علمِ دین سے دلچسپی نہیں رہی۔ بس نام اللہ کا۔

© rasailojaraid.com

مولانا عمران خاں نے یہ بھی بتلایا کہ ہر سال بھوپال میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے جس میں ایک لاکھ سے زائد مسلمان شریک ہوتے ہیں۔ مولانا نے بہ کمال شفقت مجھے اس اجتماع میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس کے بعد گاڑیاں آگئیں، مولانا بھوپال کی گاڑی میں سوار ہوگئے اور راقم السطور لکھنؤ والی ٹرین میں سوار ہوگیا۔ مولانا منصور نعمانی اور عمیر دریا بادی ہمیں شاہ گنج تک چھوڑنے آئے تھے، انھوں نے ہمیں بڑی محبت اور گرم جوشی سے رخصت کیا۔

دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

شاہ گنج سے روانہ ہو کر گاڑی ساڑھے آٹھ بجے رات کو لکھنؤ پہنچی۔ لکھنؤ کا ریلوے اسٹیشن بہت خوب صورت ہے، شہر کی سڑکیں صاف ستھری اور فراخ ہیں، جگہ جگہ پارک بنے ہوئے ہیں۔ راقم السطور مولانا عمران خاں صاحب کے حسب ہدایت سیدھا دار العلوم ندوۃ العلما کے مہمان خانے میں گیا۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی بھی وہیں فروکش تھے، انھوں نے مزاج پرسی اور سفر کے حالات سننے کے بعد فوراً میری چائے سے تواضع کی اور فرمانے لگے کہ نماز عشا کے لیے اذان ہو چکی ہے، نماز کے بعد کھانا کھائیں گے اور باتیں کریں گے۔ اس کے بعد ہم نماز عشا کے لیے مسجد میں گئے۔ ندوہ کی یہ مجلس نہایت شان دار اور حسن تعمیر کا نمونہ ہے اور وسعت کے باوجود نمازیوں کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ نماز کے بعد دستر خوان بچھا۔ میں نے دیکھا کہ بیس، بائیس آدمی شریک طعام ہیں اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لطف و بشاشت کے ساتھ سب کی طرف متوجہ ہیں کھانے کے بعد معاصر عرب ادبا کا ذکر شروع ہوا۔ مولانا فرمانے لگے کہ بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں چار ادبا معیاری اور صحیح زبان لکھنے والے تھے اور یہ ڈاکٹر تقی الدین الہلالی المراکشی، شیخ بہجت بیطار (دمشق)، شیخ بہجۃ الاثری (بغداد) اور امیر عبد اللہ (والیِ اردن) تھے۔ امیر عبد اللہ کی ادبیت اور انشا پردازی میرے لیے ایک حیرت انگیز انکشاف سے کم نہ تھی۔ مولانا نے مجھے متعجب پاکر امیر عبد اللہ کے کئی فقرے زبانی سنا دیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر احمد امین اور عباس محمود العقاد کا ذکر چل نکلا۔ مولانا نے فرمایا کہ عقاد کی خود نوشت سوانح انا (میں) بھی قابل مطالعہ ہے۔ معاصر شامی علما میں وہ ناصر الدین البانی اور جناب عبد الفتاح ابو غدہ کے علمی کمالات بیان کرتے رہے۔ معلوم ہوا کہ ابو غدہ صاحب کئی بار ہندوستان آچکے ہیں اور انھیں مولانا عبد الحی فرنگی محلی مرحوم و مغفور سے بڑی عقیدت ہے۔ اب رات کے دس بج چکے تھے، سب حضرات آرام اور شب بخیری کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے دن صبح کو مولانا نے ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے دار العلوم ندوۃ العلما کی عمارتیں دکھائے۔ رالعلوم دریائے گومتی کے پار لکھنؤ یونیورسٹی کے عقب میں واقع ہے۔ یوں تو یہ لکھنؤ کا حصہ ہے مگر اپنے می مزاج اور عربی ماحول کے اعتبار سے عالمِ عرب کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ تمام عمارتیں نہایت شان دار ہیں۔ لعلوم کی بڑی عمارت نواب بہاول پور کی جدۂ محترمہ کی فیاضی کی یادگار ہے۔ طلبا کی تعداد ایک ہزار کے قریب ، جن میں آٹھ سو ہوسٹلوں (دار الاقاموں) میں مقیم ہیں۔ شہر کے مختلف حصوں میں بھی اربابِ ندوہ کے زیرِ انتظام ومکاتب جاری ہیں۔ میرے لیے باعثِ کشش دار العلوم کا کتب خانہ بھی تھا۔ اگرچہ اس روز جمعہ کی تعطیل ی، لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے بہ کمال مہربانی میرے لیے کتب خانہ کھلوایا اور میں ڈیڑھ دو نٹے تک کتابیں دیکھتا رہا۔ یہ کتب خانہ عباسیہ ہال میں قائم ہے۔ کتب خانوں کی دیواروں پر مختلف چارٹ نقشے آویزاں ہیں، جن پر ہندوستانی مفسرین، محدثین، فقہا اور ادبا کے نام، ان کی تاریخ پیدائش و ات اور ان کے علمی کارنامے مرقوم ہیں۔ ہال کی محرابی دیوار کے ایک چارٹ پر علامہ اقبال کی یہ نظم لکھی ئی ہے:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے — جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

دار العلوم ندوۃ العلما کے کتب خانے کا شمار برصغیر کے مشہور اور قیمتی کتب خانوں میں ہوتا ہے، کتابوں کی داد اسی ہزار کے قریب ہے۔ نواب سید صدیق حسن خاں (والیِ بھوپال) اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے تب خانے بھی یہیں آگئے ہیں، قلمی کتابوں کی بھی معتد بہ تعداد موجود ہے، ان میں نواب صدیق حسن خاں ی تفسیر فتح البیان اور امام زمخشری کی تفسیر الکشاف کے قلمی نسخے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جو شیشے کے بکسوں یں محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی قلمی کتابیں ہیں جنھیں میں قلتِ وقت کے باعث نہ دیکھ سکا۔ ب کتب خانے کے لیے الگ تین منزلہ شان دار عمارت بن گئی ہے۔ کتب خانے کی صفائی و ستھرائی پر مزید توجہ ی ضرورت ہے۔

ادھر چند برسوں سے دار العلوم ندوۃ العلما عالمِ اسلام کی ایک مرکزی درس گاہ بن گیا ہے، جس میں ہندوستان کے علاوہ بہت سے بیرونی ممالک (انڈونیشیا، برما، تبت اور سواحلِ افریقہ) کے طلبا بھی زیرِ تعلیم ہیں۔ ندوہ کی امتیازی خصوصیت اس کا نصابِ تعلیم ہے، جس میں جملہ دینی علوم کی تعلیم کے علاوہ قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر، عربی زبان و ادب کی تدریس پر خاص زور دیا جاتا ہے، انگریزی کی تعلیم ایف۔ اے تک کے معیار کے برابر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دی جاتی ہے اور ثانوی درجوں میں آسان ہندی بھی سکھائی جاتی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی اور مولوی معین اللہ صاحب نائب ناظم کی نگرانی میں ہر طرف تعمیر و ترقی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ کتب خانے کی عمارت مکمل ہوچکی ہے، صرف فرش لگنے کا کام باقی ہے، ڈسپنسری کی عمارت زیرِ تعمیر ہے، مسجد کی توسیع کا کام جاری ہے اور مدرسہ تحفیظ القرآن کے لیے ایک الگ عمارت زیرِ تجویز ہے۔ علمی و دینی کتابوں کی اشاعت کے لیے مجلس تحقیقات و نشریات قائم ہے، جو ایک سو سے اوپر کتابیں اور رسائل شائع کرچکی ہے۔ ان کے علاوہ ایک عربی ماہنامہ البعث الاسلامی اور پندرہ روزہ عربی الرائد بھی شائع ہوتے ہیں۔ ندوہ کا سالانہ بجٹ دس بارہ لاکھ کے لگ بھگ ہوتا ہے، جو اہلِ خیر کے عطیات سے پورا ہوتا ہے۔

کتب خانے سے واپسی پر ڈاکٹر سید سلمان ندوی سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ موصوف ڈربن یونیورسٹی (افریقہ) میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں اور فارغ اوقات میں تبلیغ اسلام کا کام کرتے ہیں، وہ دیر تک اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی پیش رفت کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ ڈاکٹر تقی الدین ظاہری سے بھی نیاز حاصل ہوا، جو قطر کے محکمہ شرعیہ میں جج ہیں۔ اتنے میں نمازِ جمعہ کا وقت ہوگیا اور ہم نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں چلے گئے۔ مولانا سعید الاعظمی، مدیر البعث الاسلامی نے فصیح عربی زبان میں خطبہ دیا۔ نماز کے بعد ہم کھانے کے لیے مہمان خانے میں آگئے۔ کھانے کے بعد مولانا سید ابوالحسن صاحب نے راقم السطور کو نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ جناب جعفری صاحب نے سٹیشن تک مشایعت کی، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ گاڑی شام کو چار بجے روانہ ہوکر اگلے روز بارہ بجے دن کو لاہور پہنچ گئی۔ الحمد للہ یہ سفر بہ خیر و خوبی انجام کو پہنچا۔

مشاہدات و تاثرات

ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد چودہ اور پندرہ کروڑ کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے واقعات کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو مایوسی، دل گیری اور احساسِ کمتری کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، وہ بحمد للہ دور ہوکر ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کی دین داری اور سادہ زندگی قابلِ تعریف ہے۔ بیشتر مسلمان نوجوانوں کے چہروں پر خوبصورت داڑھیاں نظر آتی ہیں، اس کے ساتھ ہی ان کی معاشی بدحالی بھی قابلِ ذکر ہے۔ انھیں سب سے بڑی شکایت ملازمتوں سے محرومی کی ہے۔ شمالی ہند میں جماعتِ اسلامی اور جنوب میں مسلم لیگ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی ہیں۔ اچھوتوں اور چھوٹی ذاتوں کے ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی آہستہ آہستہ ہو رہا ہے۔ نومسلموں کی دینی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تربیت کے علاوہ ان کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگا دیا جاتا ہے۔ عوام — ہندو اور مسلمان — کی بول چال کی زبان اردو ہے۔ لکھنؤ اور فیض آباد کے نواح کے باشندوں کی زبان شستہ، شیریں اور عام فہم ہے، جب کہ بنارس کے اردگرد کے اضلاع کی زبان پوربی اردو ہے، جس کا لب و لہجہ بسا اوقات ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہوتا تھا۔ اردو کی اس ہمہ گیری کے باوجود ہر طرف ہندی زبان کا غلبہ نظر آتا ہے۔ گاڑیوں اور بسوں کے نام اور مکانوں اور دکانوں کے سائن بورڈ تمام ہندی زبان میں لکھے نظر آتے ہیں۔ اردو کو سرکار دربار اور محکمۂ تعلیم سے رخصت کر دیا گیا ہے۔ ہمارے زمانۂ قیام میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دیے جانے کے خلاف راشٹریہ سیوک سنگھ نے ہڑتال بھی کرائی، جو زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ حیرت یہ ہے کہ اردو کے مقبولِ عام ناول نگار (رام لال وغیرہ) سب ہندو ہیں۔ یو۔پی کے عربی مدارس دینی تعلیم کا مرکز ہیں، جہاں ہندوستان کے تمام صوبوں سے عربی خوان طلبا دینی تعلیم کے حصول کے لیے آتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان طلبا کی تعداد پچیس پچپن ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ ان کے اخراجات عام مسلمانوں کے چندے سے پورے ہوتے ہیں۔ ان مدارس کا معیارِ تعلیم ہمارے ہاں کے مدارس سے اونچا ہے اور مدرسین کی استعداد بھی عالی ہے۔ چوں کہ ان مدارس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور طلبا بھی مختلف صوبوں اور علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے اردو زبان ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں پہنچنے کے علاوہ انڈونیشیا، برما، تبت، نیپال اور سواحلِ افریقہ کے ممالک میں بھی اپنے قدم جما رہی ہے۔ علما کی سادہ زندگی، دردمندی اور ترحم خوئی قابلِ تعریف ہے۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں لوجہ اللہ لگے ہوتے ہیں۔ میری رائے میں جب تک یہ مدارس قائم ہیں اور ان کے بے نفس اور ایثار پیشہ اساتذہ و علما موجود ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کا قومی تشخص برقرار رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

© rasailojaraid.com